مغرب اور اسلام: مستقبل کا نقشہ

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

امریکی حکومت اور میڈیا کے مستقلاً ''دہشت گردی'' کے خلاف جہاد کے نعروں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید پوری امریکی قوم اس عمل میں شامل ہے جبکہ حقیقت واقعہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ امریکہ کے باشعور دانش ور امریکی جارحیت کے منفی اثرات کو محسوس کرتے ہوئے اپنی حکومت کو سیاسی حکمت عملی پر نظر ثانی اور ایک زیادہ حقیقت پسندانہ طرزِ عمل کی دعوت دے رہے ہیں۔ یہ آوازیں محدود سہی لیکن مختلف علمی حلقوں سے ان کا بلند ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ امریکی ابلاغ عامہ کے سحر کے باوجود Stephen M. Walt جیسے افراد، امریکی خارجہ پالیسی پر جن کا پُرمغز مقالہ زیرِنظر پرچے میں شامل ہے، امریکہ کی حالیہ ہٹ دھرمی کو قومی مفاد کے منافی خیال کرتے ہیں۔

لیکن برسراقتدار neo-conservation ٹولہ اپنے خودساختہ تصورات میں ایسا محصور نظر آتا ہے کہ اسے باہر کی دنیا بلکہ اپنے اردگرد کے ردعمل کا بھی شعور نہیں اور افغانستان اور عراق میں اپنی نام نہاد کامیابی پر نازاں وفرحاں اپنی موجودہ روش کو درست سمجھنے پر مُصر نظر آتا ہے۔ تاریخ عالم ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں جن میں فراعنۂ وقت نے اپنی قوت کے نشے میں کبھی یہ سوچنا پسند نہیں کیا کہ لکڑی کی ہنڈیا جل بھی سکتی ہے۔

امریکی امور کا ہر طالب علم اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ امریکی ملکی سیاست میں خارجہ پالیسی فی الحقیقت امریکہ کی داخلی صورت حال کو بہتر بنانے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ چنانچہ دونوں بڑی سیاسی جماعتوں نے ہمیشہ اپنے داخلی استحکام اور بالخصوص انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی خارجہ پالیسی کو بطور ایک حربے کے استعمال کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ امریکی خارجہ پالیسی میں اسرائیل کی بہرصورت حمایت داخلی طور پر دونوں پارٹیوں کے لیے مادی اور افرادی حمایت کے سبب تبدیل نہیں ہوتی۔ دونوں

بڑی جماعتوں کو مالی امداد اور بعض حلقوں میں یہودی ووٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی قیمت اسرائیلی نواز خارجہ پالیسی کی شکل میں ادا کر دی جاتی ہے۔

مسلم ممالک اگرچہ تیل کے ذخائر اور دیگر خام اشیاء کی بنا پر اہمیت رکھتے ہیں لیکن چونکہ ان کے ساتھ تعلقات اور ان کے مسائل کا حل امریکی داخلی سیاست کو بہت زیادہ متاثر کرنے والا عامل نہیں، اس لیے امریکی خارجہ پالیسی میں ان کی حیثیت ہمیشہ ثانوی ہی رہتی ہے۔

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے تکلیف دہ واقعہ نے بھی اس صورت حال کو تبدیل نہیں کیا۔ اگرچہ اس واقعہ کی ذمہ داری کلی طور پر مسلمانوں پر عائد نہیں ہوتی تاہم ان کی مزاحمتی قوت اور اس سنگین الزام پر مسلم دنیا میں موجود غم و غصے کے پیش نظر امریکہ کی خارجہ پالیسی میں کسی نمایاں تبدیلی کی توقع بے جا نہ تھی لیکن برسر اقتدار طبقہ نے اس واقعہ سے جو نتائج اخذ کیے وہ ایک منفی سیاسی فکر کی غمازی کرتے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین کر لی گئی کہ مسلمان ''انتہا پسندی''، ''دہشت گردی'' اور انقلابیت کی بنا پر امریکہ ہی نہیں بلکہ امن عالم کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور اس خطرے کو صرف قوت کے بے دریغ استعمال سے ہی دور کیا جا سکتا ہے۔

اس بات پر غور کرنے کی زحمت ہی نہ کی گئی کہ اگر بالفرض مسلمان امریکہ سے دشمنی رکھتے ہیں تو اس کے اسباب کیا ہیں اور کیا ان اسباب کو امریکی ہوائی فوج کے ذریعہ ڈیزی کٹر اور کارپٹ بمباری ہی سے دُور کیا جا سکتا ہے یا قوت کے اندھا دھند استعمال کی جگہ کوئی سیاسی حکمت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو مسلم دنیا اور امریکہ کے درمیان بڑھتے فاصلے کم کر سکے۔

سٹیفن ایم والٹ نے اپنے مقالہ Beyound Bin Laden: Reshaping U.S. "Foreign Policy" میں امریکی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کے حوالے سے جو نکات اٹھائے ہیں ہمارے خیال میں وہ حقیقت پسندانہ اور امریکہ کے مفاد میں ہیں۔ صدام حسین اور بن لادن امریکہ کے نزدیک دنیا کے خطرناک ترین افراد کیوں نہ ہوں ان کا وجود اور ان کی قوت انتہائی وقتی ہے جبکہ مسلم دنیا ایک ناقابل انکار مستقل وجود رکھتی ہے اور امریکہ اور یورپ کے اپنے مفادات کا تحفظ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ مسلم دنیا کے حوالے سے اس کی خارجہ پالیسی میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ ان تبدیلیوں کا تعلق جہاں نظری

طور پر امریکی انتظامیہ کے تصور اسلام و مسلمان سے ہے وہاں عملی طور پر ان مسائل سے بھی ہے جن میں امریکہ کے کردار نے اسے مسلم دنیا کی نگاہ میں جارح اسرائیل اور صیہونیت کا پشت پناہ بنا دیا ہے۔ فلسطین کے خطے میں امریکہ کی طرف سے اسرائیل کی مستقل طور پر سیاسی اور عسکری حمایت مسلم دنیا کے لیے نا قابل قبول ہے۔ اسی طرح کشمیر کے خطے میں امریکہ کی عدم توجہی اور زبانی جمع خرچ میں بھی غیر معمولی محتاط رویہ پاکستان کے عوام کو واضح پیغام دیتا ہے کہ وہ پاکستان کا دوست نہیں بلکہ اس کے دشمن کا دوست ہے۔ پاکستان نے ''دہشت گردی'' کے خلاف امریکہ کی نام نہاد جنگ میں جو بنیادی کردار ادا کیا ہے اس کے باوجود امریکہ کا کشمیر پر پاکستان کے موقف کی حمایت نہ کرنا ہر محبِّ وطن پاکستانی کے لیے سخت تکلیف اور غصہ کا باعث ہے۔

ان دو اہم مسائل کے ساتھ ساتھ امریکی خارجہ پالیسی کے معماروں کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ امریکہ کی جمہوریت سے وابستگی اور جمہوری نظام کے قیام کے بارے میں سنجیدگی اور اس کی طرف سے مسلم دنیا میں بادشاہتوں اور فوجی آمروں کی کھلی حمایت مسلم دنیا کے ذی شعور افراد کے لیے ایک نا قابل فہم معاملہ ہے۔ امریکہ کی اس دو عملی نے اس کے وقار اور اعتماد کو زبردست ٹھیس پہنچائی ہے اور جب تک عملی اقدامات کے ذریعے اعتماد کو بحال نہیں کیا جاتا مسلم دنیا اور امریکہ کے درمیان دوستی کی فضاء پیدا نہیں ہو سکتی۔

اس گھمبیر سیاسی پس منظر میں مغرب اور اسلام کے درمیان مکالمہ اسی وقت پُرمعنی ہوسکتا ہے جب دونوں جانب سے آج کے مسائل پر اپنے موقف کو عدل و انصاف کی بنیاد پر واضح کیا جائے اور کھوکھلے دعووں اور سیاسی نعروں کی جگہ ایک قلیل المیعاد اور طویل المیعاد حکمت عملی اس طرح وضع کی جائے جو امریکہ کے وسیع البنیاد مفاد اور مسلم دنیا کے زمینی مسائل سے مناسبت رکھتی ہو۔

مستقبل کے نقشہ کے حوالے سے تین امکانات نوشتۂ دیوار کی طرح واضح نظر آتے ہیں۔ پہلا امکان یہ ہے کہ امریکہ یک قطبی طاقت کے زعم میں یکطرفہ من مانے اقدامات کرتا رہے اور Unilateralism کے نظریہ ساتھ ایک Imperial قوت بن کر نہ صرف مسلم دنیا میں دخل اندازی کرتا رہے، جہاں توانائی کے وسیع ذخائر موجود ہیں اور جن کے بغیر مستقبل کا امریکہ روشن نہیں ہوسکتا، بلکہ

یورپ پر بھی اثر انداز ہو اور ترقی پذیر ممالک پر اپنی عسکری قوت کے زور سے عملاً ایک جدید نو آبادیاتی نظام کی صورت پیدا کر دے۔

امریکہ کی گزشتہ دس سال کی کارکردگی اور اس کے مشیروں کے بیانات کا کھرداپن، اس کا اپنے وسائل پر ناز اور ترقی پذیر دنیا کے ساتھ تحکمانہ رویہ مستقبل میں اس رویے کے بڑھنے کی غمازی کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی امکان نظر آتا ہے کہ دہشت گردی کے زیر عنوان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکی حکومت امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی اثر کو محدود کرنے اور مسلمانوں کی آبادی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکنے کے لیے قانونی اقدامات بھی کرے جیسا کہ جنوری ۲۰۰۴ء میں امریکی صدر نے اپنے ''سٹیٹ آف دی یونین'' خطاب میں اشارہ کیا۔

اس پالیسی کا وقتی اثر مسلمانوں پر لازماً پڑے گا لیکن اس سے زیادہ اس کا اثر خود امریکی مفادات پر پڑے گا اور نفرت کی وہ دیوار جو امریکی سیاسی پالیسیوں کی حماقت کی بنا پر قائم ہو چکی ہے مزید بلند اور مضبوط ہوتی جائے گی۔ نتیجتاً دونوں کے درمیان نفسیاتی کھچاؤ میں اضافہ اور آخرکار ٹکراؤ کا امکان یقینی ہو جائے گا جو نہ امریکی مفاد میں ہے نہ مسلم دنیا کے لیے مفید ہے۔

دوسرا امکان یہ نظر آتا ہے کہ امریکہ قدم بقدم مسلم دنیا اور دیگر ممالک سے اپنے عسکری وجود کو کم کرے اور مسلم دنیا کے مسائل میں حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے مسئلہ فلسطین اور مسئلہ کشمیر کو وہاں کے مقامی افراد کی براہ راست شمولیت اور رائے شماری کی بنیاد پر حل کروانے میں اپنی قوت کا استعمال کرے۔ اگر وہ اپنی پالیسی کو اس رخ پر لے جاتا ہے تو نہ صرف مسلم دنیا کو دوست بنائے گا بلکہ خود یورپ اور ایشیا میں امریکی چودھراہٹ میں کمی اور علاقائی خود انحصاری کے تصور کو تقویت دینے کا باعث بنے گا اور یورپ میں یورپی ممالک آہستہ آہستہ وہ دفاعی کردار خود ادا کر سکیں گے جو اس وقت امریکہ اپنی برتری کے اظہار کے لیے ادا کر رہا ہے۔ ادھر ایشیا میں روس اور چین کو یہ موقع ملے گا کہ وہ ان خطوں میں طاقت کے خلاء کو پُر کرنے کے لیے علاقائی تحفظ میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ گو اس سے امریکہ کی عالمی چودھراہٹ میں کمی واقع ہوگی لیکن اس کی عالمی ساکھ اور وقار میں غیر معمولی اضافہ ہوگا۔

تیسرا امکان یہ ہو سکتا ہے کہ امریکہ اپنی جارحانہ اور شہنشاہیت پر مبنی پالیسی میں اضافہ کرتے ہوئے

نہ صرف افغانستان اور عراق بلکہ یکے بعد دیگرے ایران، پاکستان اور لیبیا پر دست اندازی کرے اور اس طرح مستقبل کے لیے توانائی اور قدرتی وسائل پر قبضہ کے ساتھ ان ممالک میں اپنی عددی موجودگی کے ذریعے شہنشاہیت کے خواب کو اس کی امکانی حد تک پہنچا دے۔ اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے امریکی حکومت کو مسلم دنیا میں بادشاہتوں اور آمریتوں ہی کو وسیلہ بنانا ہوگا یا بعض صورتوں میں سطحی انداز میں جمہوریت کے قیام کے نام پر اپنی بادشاہت کے لیے راستہ ہموار کرنا ہوگا۔ عراق اس کی تازہ ترین مثال ہے۔ اور پاکستان میں فوجی فرمانرواؤں کی، جمہوریت کے وظیفہ کے باوجود، حمایت کرتے رہنا اس طرز فکر اور پالیسی کی غمازی کرتا ہے۔

ان امکانات کے حوالے سے ہمارا جواب کیا ہو، ہم مغرب اور خصوصاً امریکہ سے کس زبان میں بات کریں، کیا زبان دھمکی، دھرنے اور دھماکہ کی زبان ہو یا اس کے باطل عزائم کو تجزیاتی طور پر سمجھنے کی کوشش کے بعد مغرب کے باشعور اور باضمیر افراد کو ایک مکالمہ کی شکل میں ایک فریق بناتے ہوئے عالمی امن اور عالمی توازن کے حوالے سے عالمی اداروں، فکری آستانوں، غیر سرکاری تنظیموں، دنیا کے مذہبی رہنماؤں اور عالمی طور پر تسلیم شدہ اہل علم وفکر و دانش افراد کو جنہیں مختلف میدانوں میں نوبل پرائز جیسے اعزازات حاصل ہوئے ہوں، مخاطب کرتے ہوئے ایک مضبوط عالمی رائے عامہ (global moral force) کا قیام عمل میں لایا جائے جو ایک عالمی دباؤ بن کر یک قطبی نظام کے خلاف صف آرا ہو جائے۔

مسلم دنیا اور مغرب کے مکالمہ کی بنیاد علم اور مبنی بر علم مجادلہ ہی ہو سکتا ہے جس کے لیے ہمیں علم کے مختلف شعبوں میں نقطۂ کمال تک پہنچنا ہوگا۔ ایک مادی طاقت کا جواب یا تو ایک ویسی ہی یا برتر مادی طاقت دے سکتی ہے یا وہ علم جس کی بنا پر مادی طاقت وجود میں آتی ہے۔ ہمارے لیے فکری اور علمی محاذ اس بنا پر اور بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ ہم نے ایک صدی سے اوپر عرصہ سے اپنے اوپر مغرب کی فکری غلامی اور تقلید کو طاری کیا ہوا ہے۔ جس کا ایک کھلا سبب مغرب کی معاشی اور مادی ترقی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مغرب کی معاشی ترقی اس کی فکری ترقی کے بعد ہی وجود میں آئی اور پھر اس کی فکری قوت نے معاشی اور عسکری طاقت کے ساتھ مل کر مسلم دنیا کے بہت سے ممالک کو اپنے زیر نگیں کر لیا۔ اس عمل کو الٹانے کے لیے مسلم دنیا کو بھی علم ہی کو ذریعہ بنانا ہوگا۔